ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.4 No.4 2021

ثقافت کی جغرافیائی اساس

1. **Dr Ahmad Abdullah Qamar**

Assistant Professor of Urdu Govt. Graduate College Karor Lal Easen ahmadabdullah073@gmail.com

2. **Muhammad Ashraf**

Lecturer, Department of Urdu, Emerson University, Multan. ashrafmalik8033@gmail.com

3. **Dr. Munawar Amin**

Assistant Professor Department of Urdu, Institute of Southern Punjab Multan drmunawaramin143@gmail.com

ABSTRACT:

There are some different factors which take part in developing culture. Geography is one of them which can't be denied. People living riversides have their own culture which is different from the culture of desert areas. People of hill areas have different behavior and culture than the people of plane areas. Warm weather areas and cold weather areas also influenced their livings. It means geography has its own influence on behaviors and culture. In this article some critics and their theories are discussed in this regard.

***Key Words**: Culture, Geographical base,maternal rule of Civilization. Fraternal rule of Civilization, Pakistani Civilization, Aria, Sindh Valley, Mhonjadroh, Ganga, Jumna,*

جغرافیے کا علم تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور جہاں یہ براہ راست اپنے دائرہ کار میں آنے والے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے وہیں جغرافیے کے موسم پر اثرات، انسانی معاشرے پر اثرات، انسان کے ذہنی رجحانات کا جغرافیے سے تعلق، یہاں تک کہ سیاسیات اور ریاستی تعلقات، یہ سب جغرافیے کے اہم موضوعات بن رہے ہیں۔ انسان کا تعلق زمین سے ہے اور وہ اسی زمین پہ جنم لیتا ہے، اپنی حیات کا پورا دورانیہ زمین پر بسر کرتا ہے۔ اور پھر زمین میں ہی چلا جاتا ہے گویا زمین کو انسانی زندگی سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن مجید کہتا ہے: وہی پروردگار ہے جس نے تمھارے لئے زمین بچھونے کی طرح بچھادی۔ نقل و حرکت کے لئے اس میں راستے نکال دیئے۔ آسمان سے پانی برسایا جس سے ہم نے ہر طرح کی نباتات کے جوڑے پیدا کر دیئے۔ خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشی بھی چراؤ۔ بے شک اس میں عقل والوں کے لئے کھلی نشانیاں ہیں۔ اسی زمین سے ہم نے تمھیں پیدا کیا، اس میں تمھیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمھیں دوبارہ اٹھائیں گے۔ (طٰہٰ: ۵۳، ۵۵، ۵۴)

زمین سے انسان کا رشتہ اتنا گہرا ہے کہ فاتح کوئی علاقہ فتح کرنے کے بعد مفتوحین کے حوالے سے جو معلومات جمع کرتے ان میں وہاں کی زمین، آب و ہوا وغیرہ اہم ہوتیں۔ مسعودی (م950) کی تصنیف "مروج الذھب" میں درج ہے:

> روایان روایت شعار ذکر کرتے ہیں کہ جب عراق شام مصر وغیرہ ممالک پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب کی تو عمر بن خطابؓ نے اپنے زمانے کے ایک حکیم دانش مند کو لکھا کہ ہم عرب بدو لوگ ہیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتوحات بخشی ہیں اب ہم ان مفتوحہ ممالک پر اپنی حکومت مستحکم کرنا چاہتے ہیں اور شہر آباد کرنا چاہتے ہیں تو تم ہمارے لئے مختلف علاقوں کے حالات بیان کرو، ان کی آب و ہوا اور ان کی آبادیوں کا ذکر کرو اور یہ بھی بتاؤ کہ ان علاقوں کی مٹی اور وہاں کی آب و ہوا کا اثر وہاں کے باشندوں پر کیا ہے۔ (1)

یہ آخری بات لائق غور ہے کہ مٹی اور آب و ہوا کا وہاں کے باشندوں پر اثر ہوتا ہے۔ ڈونلڈ جوہنسن جس نے لوسی نامی فوسل ایتھوپیا سے دریافت کیا تھا اس نے صحرا میں فوسلز کی تلاش میں کافی وقت گزارا۔ اپنی کارگزاری کے بیان میں جب وہ صحرا کا ذکر کرتا ہے تو کہتا ہے کہ گرم اور خشک علاقوں میں شدت ہوتی ہے اور یہ فکر کو

بھی شدید کر دیتے ہیں۔ خدا سے تعلق جوڑنے کے متمنّی مذہبی راہب اسی لیے صحراؤں میں رہتے ہیں کہ اس سے ان کے مراقبوں اور ریاضت میں شدت پیدا ہوتی ہے (2)

ڈاکٹر وزیر آغا کلچر پر جغرافیائی اثرات کے حوالے سے کہتے ہیں:

> کلچر کا جغرافیائی مرکز پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں، جنگلوں وغیرہ کی قدرتی حد بندیوں سے وجود میں آتا ہے یعنی جب کوئی خطہ دوسرے خطوں سے جغرافیائی طور پر الگ تھلگ ہو جائے تو اس میں پھلنے پھولنے کا ایک خاص انداز سوچنے اور محسوس کرنے کا ایک خاص رویہ اور فطرت کے ڈراما میں شریک ہونے کا ایک خاص طریق خود بخود پیدا ہو جاتا ہے جو مآل کار اس کی تخلیقات اور مظاہر میں متشکل ہوتا ہے۔(3)

عموماً کہا جاتا ہے کہ پہاڑوں کے رہنے والے سخت جان اور جفاکش ہوتے ہیں، اقبال کہتا ہے

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی یا بندہ صحرائی یا مرد کوہستانی

صحراؤں کے رہنے والوں کو کھلے دل کے بتایا جاتا ہے۔ گویا ایک طرف ثقافت قومی مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہے تو دوسری طرف خود قومی مزاج جغرافیائی ماحول کے زیر اثر تشکیل پاتا ہے۔ اس طرح جغرافیائی عوامل نہ صرف قومی ثقافت پر بلکہ قومی مزاج کے رشتے سے قوموں کی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> انسانی کریکٹر اپنے گرد وپیش کے قدرتی مظاہر سے بنتا ہے، جبھی تو کسی نے کہا تھا کہ یونانیوں کی فکر وہاں کے پہاڑی سلسلوں میں ڈھونڈی جائے، یہ فکر بلا کی شفاف ہے۔ دریاؤں کے قریب رہنے والے لوگوں میں سریّت زیادہ ہوتی ہے اور وہ دریاؤں کی تغیر پذیری سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ دریائی پس منظر میں رہنے والے عوام کی طبیعتوں میں ایک خاص قسم کا جوش وخروش آجاتا ہے۔ سرد ملکوں کے لوگ زیادہ محنت کر سکتے ہیں اور گرم ملکوں کے کم۔ ان تمام عوامل کی عمل داری رضا کارانہ نہیں ہوتی۔ یہ چیزیں تو اپنی کیفیت میں اس قدر اٹل ہو جاتی ہیں کہ ان سے کلّی طور پر ٹکرانے والے لوگ پاش پاش ہو جاتے ہیں۔(4)

محمد علی صدیقی قوموں کے اختلاف کو قدرتی مظاہر میں تلاش کرتے ہیں اور ثقافت کے مسئلہ سے دوچار ہونے کے لئے جغرافیائی مظاہر کو پہلی سیڑھی قرار دیتے ہیں۔

ثقافت کا جغرافیائی تناظر اور مسلمان:

قرآن مجید میں "نظریہ حیات" کے لئے لفظ کلمہ کا ستعمال کیا گیا ہے قرآن کہتا ہے: "اے اہل کتاب آؤ ہم ایسے کلمے (نظریہ حیات) پر جمع ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے۔" (آلِ عمران: ۶۴) اور اس کلمے کو قرآن زمین سے منسلک کرتا ہے،

سورۃ ابراہیم میں خدا فرماتا ہے:

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ کس طرح مثالیں دیتا ہے؟ کلمہ طیبہ کی مثال اس شجر طیبہ یعنی اچھے پاکیزہ درخت کی سی ہے جس کی جڑیں زمین میں مستحکم اور پیوست ہیں اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ پروردگار کا کرنا ایسا ہے کہ یہ درخت ہر زمانے میں اپنا پھل دیتا ہے، اور اسی طرح اللہ مثالیں دیتا ہے لوگوں کے سمجھنے کے لئے تاکہ شائد اس طرح حقیقت ان کے دل نشین ہو جائے اور خباثت کے کلمے کی مثال اس ناکارہ اور ناپسندیدہ درخت کی سی ہے جو زمین سے اکھڑ چکا ہو اور اسے قرار اور استحکام نصیب نہ ہو۔ (ابراہیم: ۲۶،۲۵،۲۴)

یہاں کلمے سے مراد نظریہ حیات لیا جائے تو دو باتیں بہت اہم ہیں:

نظریہ حیات کا زمین سے گہرا رشتہ اور اس کا ہر زمانے میں پھل دینا۔ گویا اگر یہ زمین میں اپنی جڑیں گاڑے رکھے تو زماں کے اثرات سے محفوظ رہے گا ہر دور میں اپنے وجود پر اثبات کی مہر پائے گا۔ اور اگر زمین سے کٹ جائے گا تو پھر اسے وہ استحکام نصیب نہیں ہو سکتا۔

قدرت اللہ فاطمی نے اپنے مضمون "ثقافت کے جغرافیائی عوامل" میں تہذیب اور جغرافیے کے تعلق کے حوالے سے مسلمانوں کے علمی کارناموں کا تذکرہ کیا ہے کہ عباسیوں کے دور میں جب امن وامان قائم ہوا تو مسلمانوں میں علم کے بند سوتے پھر سے پھوٹے۔ جاحظ نے "کتاب الحیوان" میں جانوروں پر ماحول کے اثرات کا جائزہ لیا اور اس میں "عقائد پر ماحول کے اثرات" پر بھی اشارے ملتے ہیں۔ مسعودی نے "مروج الذھب" میں سیاست مدینہ اور اس پر اثرانداز ہونے والے طبعی اسباب بیان کئے ہیں مسعودی کے ہم عصر جغرافیہ دان ابن الحائک الہمدانی، اہل رستہ اور المقدسی البشاری نے تہذیب پر جغرافیائی اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ یہ تمام بحثیں بالآخر ابن خلدون کے پاس اوج کمال تک پہنچتی ہیں جس نے اس ضمن میں درج ذیل اصول متعین کیے۔

i۔ ماحول انسان کی عمرانی زندگی پر اثرانداز ہوتا ہے۔

ii۔ عمرانی اداروں کے ارتقا اور ان کے خواص اور قوموں کے اجتماعی کردار کے ساتھ آب وہوا، موسموں کے تغیرات اور زمین کی قوت روئیدگی کا گہرا رشتہ ہے۔(5)

نظریہ حیات کے ثقافت و تہذیب پر اثرات دہرانے کی ضرورت نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ زمین سے انسان کی یہ وابستگی کتنی گہری اور کتنی اہم ہے، کیا اس سے کٹ کر زندگی کے تمام ثمرات سے لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے؟ ڈاکٹر وزیر آغا کلچر اور جغرافیے کے اس تعلق کے حوالے سے دماغ کی مثال دیتے ہیں:

> ایک ساختیہ یعنی سٹرکچر ہونے کے باعث کلچر کے کچھ بنیادی ساختیاتی اوصاف ہیں جو انسانی دماغ کے ساختیاتی اوصاف کی منقلب صورتیں ہیں پھر جس طرح انسانی دماغ میں ایسی جبلی کھائیاں یا grooves موجود ہیں جو اس کے شعوری اقدامات کو ایک خاص وضع اور صورت عطا کرنے پر قادر ہیں بالکل اسی طرح انسان کے اعماق میں کلچر سازی کے وہ میلانات جبلی طور سے موجود ہیں جن کا نہایت گہرا رشتہ انسانی دماغ کی مخصوص ساخت سے ہے لہذا یہ کہنا غلط نہیں کہ جب تک انسانی دماغ کی مخصوص وضع قائم ہے انسانی کلچر کا ساختیہ بھی قائم رہے گا۔ اسی طرح ہر ملک کے کلچر کا ایک ساختیہ ہے جو اس ملک کے جغرافیے کی اساس پر قائم ہوتا ہے جب تک جغرافیہ تبدیل نہیں ہوگا ملکی کلچر کے سٹرکچر میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔(6)

یہاں آغا صاحب تہذیبی خدوخال کا مطالعہ Langue اور Parol کے حوالے سے کر رہے ہیں، گویا انسانی دماغ کی ساخت Langue ہے جس کے باعث پوری دنیا کے انسان مخصوص تہذیب کے حامل ہوتے ہیں اور Parol اس مخصوص علاقے کی صورت حال ہے جس جغرافیے میں وہ انسان رہ رہا ہے اور اس جغرافیے کے باعث اس پر جو مخصوص اثرات وارد ہوتے ہیں۔ زمین میں انسانوں کی نقل مکانی اور اس کے نتیجے میں ثقافتی میل جول، اجنبیت اور ہم آہنگی کے حوالے سے آغا صاحب کہتے ہیں:

> انسانی کلچر کی طرح ہر ملک کے کلچر کا بھی ایک سٹرکچر ہے جو اندر سے خالی ہوتا ہے مگر اس کی ساخت میں ثقافتی کھائیاں اہم رول ادا کرتی ہیں یہ ثقافتی کھائیاں اس ملک کے جغرافیے یعنی اس کی آبی گزرگاہوں، پہاڑوں، وادیوں نیز اس کی آب وہوا اور زمین کی تاثیر سے مرتب ہوتی ہیں لہذا ان کا مزاج متعین ہو چکا ہوتا ہے باہر سے آنے والے لوگ ان کھائیوں میں سفر کرتے ہیں تو کچھ ہی عرصے میں ان کا مزاج کھائیوں کی ساخت اور مزاج کے مطابق ڈھلنے لگتا ہے۔(7)

باہر سے آنے والوں اور پہلے سے موجود لوگوں سے جو دوئی جنم لیتی ہے وہ رفتہ رفتہ کم ہوتی ہے، دو تہذیبوں کا ٹکراؤ بالآخر تیسری صورت کو جنم دیتا ہے۔ لیکن آنے والے چاہے بالادست ہوں اور فاتح کے روپ میں آئیں وہ مفتوحہ سرزمین کے ارضی حقائق سے آنکھیں نہیں چرا سکتے اور انہیں اس سلسلے میں لازمی طور پر جمع تفریق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے مضمون "پاکستانی قومیت کی تشکیل نو" میں ایک سروے کا تذکرہ کیا ہے جو منیر احمد نے اعلیٰ سرکاری افسروں سے ایک سوالنامے کے ذریعے سے کیا۔ اس کے نتائج تہذیب کے جغرافیائی تناظر کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ ان کے فرائض منصبی پر علاقائی میلانات کا اثر ہوتا ہے یا نہیں، تو ان میں سے 93.5 فی صد افسروں نے اقرار کیا۔ ڈاکٹر صاحب اس پہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستان کی ذہین نسل سوچ کی کن کن منزلوں میں داخل ہو رہی ہے اس امتیاز کا الزام چاہے کسی کے سر آئے حق یہ ہے کہ ملی تشخص کو جغرافیہ سے الگ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ملی تشخص مکان سے ماوراہے لیکن کسی ایک ملک میں رہنے والوں کو ملی تشخص کی نفی کئے بغیر جغرافیائی حد بندی کے درمیان رہ کر ہی اپنی مشترک اقدار کا سراغ لگانا پڑتا ہے۔ افراد کے علاوہ زبان بھی جغرافیائی حصار کی مقید ہے۔(8)

ڈاکٹر وحید قریشی جیسا ملی انداز فکر رکھنے والا آدمی جغرافیے کی اہمیت تسلیم کرتا ہے تو اس بات کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ جغرافیہ انسانی تہذیب و ثقافت پر امٹ اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہاں ہم تہذیب کے اسلامی نظریے سے منسلک ڈاکٹر سید عبداللہ کی بات بھی نقل کرنا چاہتے ہیں جو تہذیب کی اسلامی اساس کے ساتھ جغرافیائی اہمیت کا بھی اقرار کرتے ہیں:

> قوم اپنے جغرافیے اور اپنے عقائد و اقدار کے تحت زندگی کی روش متعین کرتی ہے۔ اسی طرح مسلمانان ہند کا کلچر (تہذیب وتمدن) اپنی نوعیت رکھتا تھا۔(9)

تاہم ڈاکٹر وزیر آغا جغرافیائی حد بندی اور سیاسی حد بندی کے یکساں اثرات کی مثال بھی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ امریکہ اور انگلستان کی مثال دیتے ہوئے ان کی علیحدگی کو تاریخ کا process کہتے ہیں جس کے نتیجے میں امریکی اور انگریز الگ الگ قوم کے طور پر اپنی شناخت کرواتے ہیں حالانکہ امریکہ میں بھی زیادہ تعداد انگریزوں کی تھی۔ وہ کہتے ہیں:

> کلچر جغرافیے کی پیداوار ہے جب کوئی خطہ ارضی بعض قدرتی حد بندیوں کے باعث دوسرے خطوں سے کٹ جائے تو کچھ ہی عرصہ کے بعد اس خطہ میں زندگی کرنے کا ایک ایسا اسلوب پیدا ہوتا ہے جو دوسرے خطوں کے اسالیب حیات سے مختلف ہوتا ہے۔ مگر قوم جغرافیے کی نہیں بلکہ تاریخ کی پیداوار ہے۔(10)

دوسری مثال یورپ کی دیتے ہیں کہ اس پورے خطے میں یورپین کلچر موجود ہے جسے شپنگلر نے faustion culture کا نام دیا ہے لیکن ثقافتی اکائی ہونے کے باوجود یورپ قومی اکائی نہیں بلکہ بہت سی قوموں میں بٹا ہوا ہے۔ اسی طرح عرب ممالک بھی ثقافتی یکسانیت تو رکھتے ہیں لیکن ریاستی اعتبار سے مختلف ہیں، یوں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دقت نہیں کہ جغرافیہ ثقافت کو تو جنم دیتا ہے قوم کو نہیں، قومیں سیاسی حد بندیوں کے تابع ہوتی ہیں تاہم یہ سیاسی تقسیم جغرافیائی اثرات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان اس کی واضح مثال ہیں۔ امریکی، انگریزوں سے الگ ہوئے تو مشترک ثقافت کے وارث تھے لیکن جلد ہی ان کے تہذیبی اطوار اور زبان کا لب ولہجہ انگریزوں سے مختلف ہونے لگا اور اب امریکہ میں اگرچہ مختلف قوموں کی نمائندگی ہے لیکن ان کے ثقافتی ادغام کے باعث ایک منفرد ثقافت جنم لے رہی ہے جسے امریکی کلچر کہا جا سکتا ہے۔

ادارہ ثقافت پاکستان نے ایک کتاب شائع کی "قومی تشخص اور ثقافت" اس پر وزیر آغا صاحب نے ریویو لکھا جو ان کی کتاب "کلچر کے خدوخال" میں شامل ہے۔ اس مضمون میں آغا صاحب نے چند ماہرین کی تعریفیں شامل کی ہیں، جن میں سے انتظار حسین کی بات جغرافیائی تناظر کے حوالے سے مفید مطلب ہے:

> تاریخ اور جغرافیے کا یہ کرشمہ ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ایک ایسی تہذیب کا ڈول پڑا جو مذہب کے حوالے سے دوسرے خطوں میں مسلمانوں کی تہذیب سے اشتراک رکھنے کے باوجود اپنی ایک امتیازی شکل وصورت رکھتی تھی مگر کوئی بڑی اور زندہ تہذیب یک رنگ نہیں ہوتی۔ دائرے کے اندر بھی دائرے ہوتے ہیں اور رنگ کے اندر رنگ

ہوتے ہیں۔ ایسے تہذیبی رنگ بھی ہوتے ہیں جن میں جغرافیہ کا عمل زیادہ ہوتا ہے۔ اور زمین کی بو باس زیادہ رچی ہوتی ہے۔ علاقائی تہذیبوں کی صورت یہی ہوتی ہے۔(11)

پاکستانی کلچر کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا کے موقف کی روشنی میں تہذیبی خاکہ مرتب کرنے کی کوشش جہاں تاریخ اور جغرافیے سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے وہیں ریاستی حدود کا اثر بھی اہم ہے اور قیام پاکستان سے اس علاقے کے منفرد کلچر کی نمو عین فطری تقاضا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

کلچر جغرافیے کی پیداوار ہے اور ریاست ہمیشہ ایک نئے جغرافیے کو وجود میں لاتی ہے۔ لہذا ریاست کے وجود میں آنے کے بعد اس کی تحویل میں آیا ہوا کلچر بھی اپنی صورت بدلنے لگتا ہے اور اپنی سرحدوں کے اثرات کے تحت بالآخر ایک نئی شکل اختیار کر لیتا ہے۔(12)

یہاں ایک نکتہ قابل وضاحت ہے کہ اس نظریے کی اساس جغرافیہ ہے اور برصغیر کو جغرافیائی طور پر ایک وحدت سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اس غلط فہمی کا امکان موجود ہے کہ اس اعتبار سے ہندوستان اور پاکستان کی ثقافت ایک ہی ہوئی یا ہونی چاہیے۔ لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ ان میں بُعد موجود ہے۔ یہاں تک کہ ہندو اور دیگر اقوام کو تو رہنے دیجئے ایک طرف خود مسلمان جو لکیر کے اس پار اور اس پار رہتے ہیں ایک دوسرے سے قدرے مختلف ثقافتوں کے حامل ہیں۔ اس لیے برصغیر کی جغرافیائی حیثیت کا تعین کرنا ضروری ہے۔

برصغیر: جغرافیائی وحدت؟

اوپر کہیں کہیں وادی سندھ کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد صرف صوبہ سندھ ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ پورا علاقہ جو موجودہ پاکستان ہے اور بظاہر علیحدگی کی علامات نہیں رکھتا لیکن ہر اعتبار سے اور تاریخ کے مختلف واقعات کی رو سے اپنی علیحدگی کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اعتزاز احسن اپنی کتاب "سندھ ساگر" میں لکھتے ہیں:

میری دانست میں وادی سندھ کو وسطی ایشیا سے الگ کرنے والے عظیم سلسلہ کوہ کی نسبت وہ غیر محسوس سی سرحد جو اس وادی کو ہند سے الگ کرتی ہے کہیں زیادہ اہم اور فیصلہ کن ہے۔ یہ خط تقسیم مشرقی پنجاب میں گورداس پور سے لے کر کاٹھیا واڑ (بحیرہ عرب) تک ایک غیر محسوس ابھار کی شکل میں موجود ہے۔(13)

بادی النظر میں یہ تقسیم فطری محسوس نہیں ہوتی لیکن تاریخ ایسے واقعات کی شہادت پیش کرتی ہے کہ یہ غیر محسوس ابھار محسوس ہونے لگتا ہے اور پاکستان کے قیام کا علاقہ اپنی علیحدگی کے آثار ماضی سے پیش کرتا ہے۔ اس بات کی تائید سلطنت دہلی کے وسط ایشیائی فرمانرواؤں کے تفکر سے ہوتی ہے جو وادی سندھ کے مرکز گریز رویّے سے پریشان رہتے تھے اور سلطان قطب الدین ایبک نے تو اس فکر مندی میں پایہ تخت دہلی سے لاہور منتقل کر لیا۔ کیوں کہ وادی سندھ کے لوگوں کا فطری رجحان شمال مغربی ہمسایوں کی طرف تھا۔ اس حوالے سے ثقافتی اور لسانی قرابت داری ایک بیّن ثبوت ہے جب کہ وادی گنگا کے ساتھ رشتوں کے ایسے مضبوط دھاگے فراواں نہیں۔

اعتزاز احسن کے الفاظ میں:

تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ وسطی ایشیا کے ایرانی، افغانی علاقے اور وادی سندھ ہمیشہ ایک دوسرے کے لیے بے پناہ کشش محسوس کرتے رہے۔(14)

تاہم اس حقیقت پر حرف گیری کی گنجائش موجود ہے کہ ایک طویل عرصے کے مختلف وقفوں میں وادی سندھ کا وادی گنگا وجمنا سے انسلاک کس زمرے میں رکھا جائے گا؟۔ اس انسلاک سے انکار کی گنجائش نہیں لیکن یہ خالص مادی حوالے سے اور معروضی حالات کے باعث تھا کہ ہندوستان میں لوہے کے ذخائر وادی سندھ سے

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.4 No.4 2021

بہت دور تھے اور دور آہن میں، جب اس دھات کی دستیابی کسی علاقے کی ترقی کے لیے بہت ضروری تھی وادی سندھ کا وادی جمنا سے منسلک ہونا ضروری تھا تاکہ Iron Age کے ثمرات تک پہنچا جاسکے۔ یہ عظیم کارنامہ اشوک اعظم کے دور میں انجام دیا گیا تاہم اس انسلاک میں تسلسل نہیں تھا۔ اعتزاز احسن اس کا جواب یہ دیتے ہیں:

> حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ چھ ہزار سالوں کے دوران میں وادی سندھ نے کم و بیش ساڑھے پانچ ہزار سال تک ہند سے الگ اپنی خود مختار حیثیت بر قرار رکھی ہے۔ صرف موریا، مغل اور فرنگیوں کی عظیم سلطنتوں کے دوران یہ دونوں خطے ایک واحد مملکت کے طور پر اکٹھے ہوئے ہیں لیکن سلطنتوں کا یہ مجموعی دورانیہ پانچ سو سال سے زیادہ نہیں تھا۔(15)

موریا سلطنت کو یہ افتخار حاصل ہے کہ انھوں نے گنگا کی دور افتادہ وادیوں سے لے کر وادی سندھ تک حکمرانی کا خواب دیکھا لیکن وادی سندھ کی جداگانہ حیثیت اور الگ تشخص سے وہ بے خبر نہ تھے اور مزاجاً اسے آزاد خطہ سمجھتے تھے۔ موریا حکمران وادی گنگا کی راج دھانی کو محفوظ سمجھتے تھے کہ وادی سندھ میں کوئی دشمن حکومت بر سر اقتدار نہ تھی اور خطرہ اسی طرف سے تھا۔ تاہم وادی سندھ پر بیرونی یلغار سے نبرد آزما ہونے کے لیے چوکس فوج کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ موریا کی یہ حکمت عملی بعد ازاں انگریزوں نے بھی اختیار کی۔ اس پوری حکمت عملی سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ وادی سندھ اشتراک عمل کے باوجود الگ مزاج کی حامل تھی اور حربی حوالے سے وادی گنگا و جمنا سے منفرد تقاضے رکھتی تھی۔

پھر اگر دریاؤں کے بہاؤ کو دیکھیں تو بھی اس قدرتی تقسیم کی وضاحت ہوتی ہے پاکستان کے تمام دریا شمالاً جنوباً بہتے ہیں جب کہ ہندوستان کے دریاؤں کا بہاؤ شمال سے مشرق کی طرف ہے۔ دریائے گنگا اور سندھ کے ماخذ ایک دوسرے سے صرف سو میل کے فاصلے پر ہیں لیکن پھر یہ مخالف سمت میں سفر کرتے ہوئے پندرہ سو کلومیٹر کا درمیانی فاصلہ قائم کرتے ہوئے اپنے اپنے سمندروں میں گرتے ہیں۔

بہاؤ کے اس نقشے سے اس غیر محسوس ابھار کے نظریے کو ثابت کرنا مقصود ہے جو اس بظاہر ایک خطے کو جغرافیائی حوالے سے ایک دوسرے سے مختلف کرتا ہے۔ مرزا ابن حنیف نے پاکستان کے تاریخی آثار پر کام کیا ہے۔ وہ رگ وید کے حوالے سے اسے الگ خطہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> رگ وید کا بیشتر حصہ ہمارے اپنے پاکستان ہی میں تخلیق ہوا تھا اور قدیم پاکستان کے غیر آریائی اور نووارد آریائی شعرا کا کلام اس منظوم کتاب (رگ وید) میں شامل ہے۔ رگ وید میں پاکستان کا نام سپت سندھاوا (سات دریاؤں کی سرزمین، سات دریاؤں کا ملک) آیا ہے۔(16)

یہ بات عام طور پر کہی گئی کہ وادی سندھ کے لوگوں نے بیرونی حملہ آوروں کو راستہ دیا اس غلط فہمی کی وجہ یہ کہ شمالی ہند کی طرف نظریں لگانے والے اکثر حملہ آور وسط ایشیا، ایران اور غرب کی طرف سے آئے اور انھیں وادی سندھ عبور کر کے وہاں تک پہنچنا تھا۔ گویا یہ ایک دفاعی فصیل تھی جسے کمزور قرار دیا گیا لیکن دیکھنا یہ بھی ہے کہ کتنے حملہ آور دہلی تک پہنچ سکے اور کتنے یہاں سے واپس ہوئے۔

سکندر یقیناً وادی سندھ سے واپس جانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ راجہ پورس کے ساتھ اس کا مقابلہ تاریخ نے سکندر کی جیت سے فیصل کیا لیکن یہ سوال قائم ہوا کہ کہ وہ واپس کیوں ہو لیا؟ محمود غزنوی کا سومنات تک پہنچنا سب کے علم میں ہے لیکن وہ کتنی بار وہاں پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوا؟ اور اسے آگے بڑھنے سے کس نے روکا؟ اور پھر بابر۔۔۔۔۔

اعتزاز احسن لکھتے ہیں:

> بابر ہندوستان پر قبضہ کرنے کی تیسری کوشش کے دوران بھیرہ، سیالکوٹ اور دیپالپور تک آسکا لیکن پنجاب میں سخت ترین مزاحمت کے باعث دہلی کا تخت بدستور اس کی پہنچ سے دور رہا۔ دراصل وادی سندھ کے بہادر لوگوں کی پناہ میں ہندوستان دفاعی اعتبار سے ایک ایسا مضبوط قلعہ تھا جہاں تک پہنچنا بھی حملہ آوروں کے لیے آسان نہیں تھا۔ وادی سندھ کی مزاحمت

ہر مرتبہ ایک ناقابل تسخیر دیوار کی طرح حملہ آوروں کا راستہ روکتی رہی۔ ہر دفعہ گرمیوں کے آغاز پر بابر کو واپس کابل کی طرف پسپائی اختیار کرنا پڑتی۔(17)

بابر نامے میں خود بابر اس پریشان کن صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ 29 دسمبر 1525 کو اس نے لکھا:

سیالکوٹ پر قبضے کے باوجود جاٹ اور گوجروں کی مزاحمت جاری رہی۔(18)

یہ شواہد اس غلط فہمی کو رفع کرتے ہیں کہ وادی سندھ ایک کمزور فصیل تھی یا آنے والوں کو خوش آمدید کہتی رہی بلکہ قرائن شاہد ہیں کہ وادی سندھ نے ایک مضبوط فصیل کے مانند حملہ آوروں کا منہ چڑایا۔

زمینی ثقافت کا نظریہ

ثقافت کے زمینی نظریے کے سب سے اہم موئید ڈاکٹر وزیر آغا ہیں. ڈاکٹر وزیر آغا کلچر کو جغرافیائی مرکز سے وابستہ قرار دیتے ہیں:

کلچر ہمیشہ ایک جغرافیائی مرکز سے وابستہ ہوتا ہے جتنا مضبوط یہ جغرافیائی مرکز ہوگا اتنا ہی کلچر اپنی مجرد حیثیت میں باقی رہ سکے گا۔(19)

ڈاکٹر وزیر آغا اپنے اسی مضمون میں کلچر کے ارتقا اور نمو پر بھی بات کرتے ہیں ان کے خیال میں کلچر کے گرد کا چھلکا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سخت ہوتا جاتا ہے اور اس کی قوت نمو کمزور پڑ جاتی ہے اس کے ارتقا کے لیے ضروری ہے کہ وقتاً فوقتاً کوئی بدیسی کلچر جغرافیائی حد بندیوں کو عبور کر کے آئے اور اس کے سخت ہوتے چھلکے کو پارہ پارہ کر دے ورنہ یہ اپنی قوت نمو اور ارتقا سے محروم ہو جائے گا۔ اس ضمن میں وہ مشرقی ممالک پر مغربی تہذیب کی یلغار کی مثال دیتے ہیں۔ اور ایسی تہذیبیں جن پر کوئی بدیسی تہذیب کی یلغار نہیں ہوئی اسے ثقافتی انجماد میں مبتلا قرار دیتے ہیں جیسے براعظم افریقہ کے بعض قدیم اور دور افتادہ قبائل۔

پاکستان کی ثقافت وزیر آغا کے خیال میں اس نفسیاتی عمل کی طویل داستان ہے جس کا آغاز وہ وادی سندھ کی قدیم تہذیب سے کرتے ہیں:

اس داستان کا نقطہ آغاز تو وادی سندھ کی تہذیب ہے جسے منظر عام پر لانے میں سر مارٹیمر ویلڈ نے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ یہ تہذیب دو تین ہزار برس تک اس خطے میں پھلتی پھولتی رہی اور مختلف عناصر کی آمیزش سے جو ہزارہا برس پر پھیلے ہوئے ہیں اس کا ایک خاص مزاج متعین ہو گیا۔ پندرہ سو برس قبل مسیح کے لگ بھگ آریاؤں نے وادی سندھ کے علاقے پر یلغار کی اور اس کے باشندوں کے ساتھ جنگ کا آغاز کر دیا۔ آخر میں آریاؤں کو فتح ہوئی اور آریاؤں نے ان پر اپنی تہذیب مسلط کر دی لیکن وادی سندھ کی تہذیب فنا نہیں ہوئی بلکہ اس بیرونی دباؤ کے تحت معاشرے کے باطن میں سمٹ کر اجتماعی لاشعور کا حصہ بن گئی۔ چنانچہ بعد ازاں جب آریاؤں کے ہاں فنون لطیفہ، مذہب، زبان اور دوسرے ثقافتی مظاہر کو فروغ ملا تو ان میں وادی سندھ کے معاشرے کے کثیف عناصر رفعت آشنا ہو کر نہ صرف شامل ہوئے بلکہ فتح کے پرچم بھی لہرانے لگے۔ گیارھویں صدی میں اس مخلوط معاشرے پر مسلمانوں نے حملہ کیا اور سارے برصغیر پر چھا گئے اس خارجی دباؤ کے تحت قدیم کلچر کی کثیف لہریں سمٹ کر اجتماعی لاشعور کا حصہ بن گئیں اور پھر کافی عرصہ کے بعد فنون لطیفہ کے ایک ایسے تازہ ابال کی صورت میں سامنے آئیں جس میں اب سندھی تہذیب کے علاوہ آریائی تہذیب کی آمیزش بھی تھی اور مسلمانوں کا اسلوبِ زیست بھی اپنی جھلکیاں دکھا رہا تھا۔ کئی سو برس بعد اس برصغیر پر مغربی تہذیب کی یلغار کا سامان ہوا اور حسب سابق واپسی Regression کے عمل نے خود کو دہرایا اس طور کہ اب سندھی، آریائی اور اسلامی تہذیب کا مشترکہ پیکر خارجی دباؤ کی زد میں آیا اور اس نے سمٹ کر خود کو اجتماعی لاشعور میں ضم کر دیا چنانچہ پچھلے پچاس برس میں فنون لطیفہ کا جو تازہ عروج سامنے آیا ہے اس میں اب قدیم سندھی اور آریائی اثرات کے پہلو بہ پہلو اسلامی تہذیب کے نسبتاً جدید اثرات بھی شامل ہیں۔(20)

پاکستان کے جغرافیائی ثقافتی نقوش پر بات کرنے والوں میں احمد ندیم قاسمی کی قلمی کاوشیں بھی اہم ہیں۔ اپنے مضمون "پاکستانی تہذیب کی صورت پذیری" میں وہ شکوہ کناں ہیں کہ ہم نے پاکستانی تہذیب کی انفرادیت کو ثابت کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا جس کی وجہ سے ابھی تک اس پہ بحث جاری ہے۔ گو وہ بحث کو مفید خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بغیر بحث کے کسی نقطے پر بہت سے لوگوں کا اتفاق ان کی سادہ لوحی کی دلیل ہوتا ہے اس لیے بحث ضروری اور اہم ہے لیکن ان کے

خیال میں بیس برس میں اس مسئلے کو طے ہو جانا چاہیے تھا۔ احمد ندیم قاسمی پاکستانی تہذیب کو اس خطے کی معلومہ تاریخ سے آغاز کرنے کے حق میں ہیں۔ وہ ایک نامور دانشور کی تقریر کا حوالہ دیتے ہیں جنھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ہمارا کلچر امریکی، برطانوی اور دیگر کلچروں سے مل کر بنا ہے۔ قاسمی کہتے ہیں:

> پھر جب ہم اپنے کلچر میں اس کردار کا اعتراف بڑی فراخ دلی سے کرتے ہیں جو انگریز نے ہم پر مسلط ہو کر ادا کیا تو نہ جانے ہمیں اس خطہ ء ارض کی معلومہ تاریخ سے اپنے کلچر کا آغاز کرنے سے کیوں شرم آتی ہے۔ جو آج پاکستان کہلاتا ہے اور جو پاکستان کہلانے سے پہلے ویرانہ نہ تھا بلکہ یہاں کتنی تہذیبیں ابھریں، پھیلیں، رکیں اور خاک ہو گئیں۔(21)

تہذیبوں کے آغاز اور انجام کا معاملہ بھی اچانک نہیں ہوتا بلکہ کسی نئی تہذیب کے ابھار میں گزشتہ تہذیبوں کے نقوش وضاحت سے مل جاتے ہیں اور مرتی ہوئی تہذیبیں بالکل فنا نہیں ہوتیں بلکہ اپنا بہت سا اثاثہ چھوڑ جاتی ہیں جو نئی تہذیب کی آرائش و زیبائش میں استعمال ہوتا ہے اکثر ثقافتی علما اس خیال سے متفق ہیں اور وہ اسے غلط بھی نہیں مانتے البتہ نئے نظامِ خیال میں کون سی بات قابلِ قبول ہے اور کون سی ناقابلِ قبول اس کا فیصلہ وقت کرتا ہے اس کے لیے کسی شعوری کاوش کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ نظامِ خیال کی قوت اس تبدیلی کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس لیے تہذیبی تسلسل سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ قاسمی کہتے ہیں:

> جب تہذیبیں مرتی ہیں تو اپنی بعض نشانیاں ضرور چھوڑ جاتی ہیں۔ انسانوں کی طرح جو مر جاتے ہیں مگر اپنی اولاد کے روپ میں زندہ رہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ آج کسی بھی ملک کی تہذیب کو لے لیجیے اس میں اس ملک کی قدیم ترین تہذیب کی جھلکیاں ضرور موجود ہوں گی۔ دیا سلائی ایک چراغ کو جلا کر خود بجھ جاتی ہے مگر چراغ کی لو میں وہ اپنے وجود کا اعلان کرتی رہتی ہے۔(22)

اس کے بعد وہ موہنجوداڑو تہذیب کی نشانی بیل گاڑی کا ذکر کرتے ہیں جو آج بھی سندھ اور پنجاب کی سڑکوں پر چل رہی ہے۔ اور پھر لباس کے حوالے سے کہ جسے ہم اپنا قومی لباس کہتے ہیں اور جس کی بعض صورتیں ہلاکو خان اور اس کے لشکریوں سے مشابہ ہیں، کیا ہم انھیں رد کر دیں کہ انھوں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ گویا تہذیبوں میں پرانے تہذیبی مظاہر کا سفر چلتا رہتا ہے اس سے مخاصمت نہیں ہونی چاہیے۔ اگرچہ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستانی تہذیب کا عنوان یقیناً تہذیب کا اسلامی تصور ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی قبول کرنی چاہیے کہ

> ہر تہذیب میں اس مٹی کی بوباس ضرور آجاتی ہے جہاں وہ تہذیب پیدا ہوئی، پھیلی پنپی اور بدلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے بھی اسلامی ممالک اس وقت کرہ ارض پر موجود ہیں ان کی تہذیبیں اگر بعض بنیادی امور میں مماثل ہیں تو بعض تفاصیل میں مختلف بھی ہیں۔(23)

ڈاکٹر سلیم اختر کا تہذیبی نظریہ بھی وزیر آغا کی نظریاتی تائید کرتا ہے وہ بھی دراوڑوں کے ساتھ آریاؤں کے اختلاط سے اس کا آغاز کرتے ہیں اور آریاؤں کا صحیح معنوں میں ہندوستانی بن جانا آغا کے اس نظریے کی تائید ہے کہ زمینی کلچر بالآخر نوواردوں پر غالب آجاتا ہے پھر مسلمانوں کی آمد ہوتی ہے اور مسلمان بھی ہندوستانی بن جاتے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر سلیم اختر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تہذیبی لین دین اور ہند ایرانی کلچر میں دونوں کے نفوذ کا ذکر کرتے ہیں اور پھر انگریزوں کی آمد اور ان کے یہاں کی تہذیب پر اثرات بیان کرتے ہیں، جس میں سرسید کی کاوش شعوری اور دیگر مسلمان غیر شعوری طور پر اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی مرعوب مسلمان اذہان شعوری اور غیر شعوری طور پر قائد اقوام عالم، امریکہ سے متاثر ہو رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک پاکستانی کلچر کی بات ہے، سلیم اختر سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا پاکستان میں کلچر نام کی کوئی شے موجود ہے؟

فیض احمد فیض پانچ ہزار سال قبل سے پاکستان کی تاریخ شروع کرنے میں اگرچہ اشکال سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں:

> ایک تو یہ کہ اگر آپ موہنجوداڑو کو اپناتے ہیں تو موہنجوداڑو کے بعد جتنے دور گزرے ہیں وہ سب آپ کو اپنی تاریخ کا حصہ ماننے پڑیں گے۔(24)

لیکن کلچر کے طول، عرض اور گہرائی پر طویل گفتگو کے بعد فیض بالآخر پاکستان کے لیے تاریخ کے آغاز کے اسی نظریے کو اپناتے ہیں۔ کیوں کہ ہم پاکستانی ہیں اور پاکستانی تہذیب کو ایک طرف ہندوستان سے الگ کرنا ہے اور دوسری طرف دیگر اسلامی ممالک سے بھی ہم منفرد تہذیبی تاریخ کے حامل ہیں اس لیے وہ کہتے ہیں :

> ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ چونکہ ہماری تہذیب میں یہ دونوں عناصر شامل ہیں یعنی ایک طرف ہماری وطنیت اور دوسری طرف ہمارا دین۔ اس لیے ہماری تاریخ پانچ ہزار سال پرانی ٹھہرے گی۔ ہر چند کہ اس میں تین یا چار ہزار سال کی تہذیب ہندوستان کے ساتھ مشترک ہے اور اس کی تہذیبی روایات ہندوستان کے ساتھ منسلک ہیں لیکن اس میں ایک حصہ ایسا ہے جو کہ ہندوستان کے ساتھ مشترک نہیں ہے یا ہندوستان کے غیر مسلموں کے ساتھ مشترک نہیں ہے وہ ایک ہزار سال کا حصہ ہے جو کہ اسلامی دور کا حصہ ہے۔ اس دور کی جو تہذیبی روایات ہیں اس کا فن اس کے عقائد، اس کے رہنے سہنے کے طریقے، اس کے رسم و رواج وہ غیر مسلموں کے اور ہندوستانیوں کی تہذیبی روایتوں سے قطعی مختلف ہیں چنانچہ یہ چیز ہم کو ہندوستان سے ممیز کرتی ہے۔ دوسری طرف ہماری پہلی چار ہزار سال کی تاریخ ہے یہ ہم میں اور باقی اسلامی ممالک میں مشترک نہیں ہے۔۔۔۔ یہ دونوں چیزیں مل کے ایک خصوصی چیز پیدا ہوتی ہے، ایک انفرادی چیز پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاکستان کی تہذیبی شخصیت کہتے ہیں۔(25)

زمینی ثقافت سے ملتا جلتا نظریہ پاکستانی ثقافت کا ہے تاہم اس میں اعتزاز احسن کا پاکستان کے حوالے سے وہ نظریہ کارفرما ہے جو قبل ازیں بیان ہوا کہ پاکستان جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان سے الگ خطہ ہے اس لیے اس کی ثقافت بھی پاکستانی ثقافت کہلائے گی۔ اعتزاز احسن نے اسے اپنی کتاب سندھ ساگر میں بیان کیا۔ اگرچہ اس پر بہت زیادہ بحث نہ ہو سکی تاہم ہمارا خیال ہے کہ بالآخر پاکستان کی تہذیب و ثقافت کے لیے جو نام موزوں ہو گا وہ پاکستانی ثقافت کا ہی ہو گا۔ اس لیے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ ہمیں ہندوستان سے ممیّز کرتا ہے۔ عکسی مفتی نے اپنی کتاب "پاکستانی ثقافت" میں اس نظریے کو لائقِ غور قرار دیا ہے وہ اس حوالے سے اعتزاز احسن اور اشفاق احمد کو روشن دماغ اور پڑھا لکھا قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اعتزاز احسن جنھوں نے اپنی کتاب "The Indus Saga" میں پاکستانی معاشرے کی بنیاد تلاش کی ہے اس آغاز نے ہمارے اس ثقافتی منبع تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ جس نے پوری تہذیب پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ وادیِ سندھ کی تہذیب (Indus Valley Civilisation) اس میں شک نہیں کہ یہ قدیم تہذیب آج بھی پاکستانی معاشرے کی مادی، علمی اور روحانی زندگی میں جھلکتی ہے، ہمارے جغرافیے اور ثقافت پر اثر انداز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جغرافیائی اور ثقافتی لحاظ سے ہمیشہ سے ہندوستان سے مختلف رہے ہیں جس کا رجحان براہمنی اور گنگا جمنی ثقافت سے رہا ہے۔ آپ اعتزاز احسن سے متفق ہوں یا اختلاف رکھیں انھوں نے انتہائی محنت اور سنجیدگی سے ان بنیادی سوالات کا سامنا کیا ہے جو ہر پاکستانی کی کھوج ہیں۔ ہماری ثقافتی جڑیں (Grass roots) کہاں ملتی ہیں؟ اس کی بنیادی حالت کیا تھی اور ہم ہندوستانی ثقافت سے کیونکر مختلف ہیں؟(26)

اشفاق احمد کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے باقاعدہ تحریری اشاعت تو اس نظریے کی نہیں کی تاہم وہ گفتگو میں پاکستانی ثقافت کے ہندوستانی ثقافت سے الگ ہونے کو دلائل سے بیان کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ اگرچہ لوک ریت، مقامی بولیوں، نسلوں، ناچ گانوں وغیرہ میں اشتراک کے قائل تھے تاہم پیدائش، موت اور موت کے بعد آخرت کے تصور، شادی بیاہ، تہوار اور دینی رویوں میں اختلاف کے باعث پاکستانی ثقافت کو ہندوستانی ثقافت سے الگ قرار دیتے تھے۔(27)

اشفاق احمد کے اس نظریے پر غور کیا جائے تو یہ سجاد باقر رضوی کے مادری پدری اصولِ تہذیب کے نظریے جیسا ہی نظر آتا ہے صرف بیان کرنے کا انداز مختلف ہے۔ سجاد باقر رضوی کا نظریہ آگے آرہا ہے۔

پاکستانی ثقافت کا یہ نظریہ دراصل قومیت کے احساس کا اظہار ہے لیکن ہماری بدقسمتی یہ رہی ہے کہ قوم پرستی کے احساس کو مذہب کی طرف سے بری طرح رگید اگیا اور اس کے مقابل ملتِ اسلامیہ کا تصور پیش کر کے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی گئی۔ اقبال جیسا صاحبِ نظر جب قوم پرستی پر مبنی شاعری سے توبہ تائب ہو کے یہ کہے کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

تو ہما شما کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک طویل عرصہ قومیت کا ذکر ہی معدوم رہا حالانکہ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کا تصور بھی مختلف قوموں کے داخلی تضادات کو قبول کرنے پر ہی منحصر ہے اور اسی طرح کسی بھی طرح کی بین الاقوامیت قوموں کو نظر انداز کر کے وجود میں نہیں آسکتی۔ قومی ثقافت کی تشکیل کے لیے قومیت کے تصور کی اہمیت پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

> قومی ثقافت کے ارتقا اور ترقی کے لیے قومیت کے احساس کی ضرورت ہے اور اس کے لیے اپنی لینڈ سکیپ سے محبت۔ کوئی شخص اپنی لینڈ سکیپ کے سلسلہ میں غریب نہیں ہوتا۔ مذہب کو بھی اس فرق سے نمٹنا پڑتا ہے اور اس مسئلہ کو ایک بڑا مسئلہ سمجھنے ہی میں نجات ہے ورنہ ہم الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں مارتے رہیں گے۔(28)

مادری و پدری اصول تہذیب

تہذیب کے مذہبی اور جغرافیائی تصور پر بات کرنے والوں میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی بھی شامل ہیں جو تہذیب کی تشکیل کا ایک باقاعدہ نظام وضع کرتے ہیں اور کسی بھی مثالی تہذیب کے لیے ان دونوں (مادری اور پدری اصول) کی شرکت لازم خیال کرتے ہیں چاہے ان کا تناسب مختلف ہو۔

مادری و پدری اصولوں کے حوالے سے سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں:

> انسان کی تخلیقی زندگی میں دو اصول کارفرما ہوتے ہیں۔ پہلا اصول جذبات و جبلتوں کا تخلیقی اصول ہے جس کا مقصد تخلیق ہے اور دوسرا اصول تہذیب کی وہ شعوری دنیا ہے جو انسانی زندگی کے لیے رہنما اصول فراہم کرتی ہے۔ اب آپ تخلیقی اصول کو مادری اصولِ زندگی کہہ لیجیے اور تنظیمی اور رہنما اصول کو پدری اصول زندگی کہہ لیجیے۔ یہ پدری اصول زندگی مادری اصول زندگی سے مل کر تخلیق کا ذریعہ بنتا ہے۔(29)

یہاں مادری اصول سے مراد زمین ہے اور پدری اصول آسمان کی نمائندگی کرتا ہے گویا اس نظریے کی رو سے تہذیبی تشکیل نہ محض زمین کی بنیاد پر ہوگی اور نہ محض آسمانی تعلیم پر بلکہ دونوں کے تخلیقی ملاپ سے وجود پذیر ہوگی اور اس میں دونوں کی نمائندگی ہوگی۔

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کا مادری و پدری اصول کا یہ نظریہ حسن عسکری کے ہند اسلامی ثقافت کے نظریے سے مماثل ہے لیکن اس کی بنیاد زیادہ سائنسی اور تنقیدی ہے۔ ان کے خیال میں ہر تخلیقی عمل کے پیچھے مادری و پدری اصول کارفرما ہے اور تہذیب بھی چوں کہ تخلیق کا ہی ثمر ہے اس لیے یہ بھی مادری و پدری اصول سے ماورا نہیں۔ یہاں یہ بات دل چسپی سے خالی نہ ہوگی کہ کائنات میں مادری و پدری اصول میں جب بھی عدم توازن ہوگا انقلابی فکر کے لیے راہ ہموار ہوگی اور اسے قبولِ عام حاصل ہوگا کیوں کہ وہ توازن پیدا کرنے کے لیے وجود میں آئے گی۔ اس اعتبار سے سجاد باقر رضوی روسو کا ذکر کرتے ہیں کہ جب اس نے فطرت کی طرف لوگوں کو پکارا تو یورپ پدری اصول میں جکڑا ہوا تھا اور عقل اس کی نمائندگی کرتی تھی روسو نے پدری اصول کو مادری اصول سے مربوط کر دیا جو اس کا بڑا کارنامہ تھا۔ وہ کہتے ہیں:

ایسے عہد میں جب کہ ساری اہمیت صرف تخلیق کے ذریعے کو دی جارہی تھی اور پدری اصول زندگی اہم سمجھا جاتا تھا، روسو نے ہمیں مقصد تخلیق کی طرف توجہ دلائی اور مادری اصول زندگی کی اہمیت واضح کی۔(30)

سجاد باقر رضوی موجودہ دور کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں پدری اصول زندگی کی کارفرمائی نہیں ہے اس لیے معاشرہ نراجیت کا شکار ہے۔ ایسے میں ہمیں پدری اصول کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں ہمیں سجاد باقر رضوی کی بات میں کچھ تضاد محسوس ہوتا ہے جب وہ ایک طرف تو پدری اصول کی طرف لوٹنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور دوسری طرف پاکستانی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے اس گروہ پہ تنقید کرتے ہیں جو تہذیب کے پدری اصول کے زیر اثر تمام اسلامی ممالک سے رشتہ استوار کرنے پر مصر ہے اور مادری اصول سے منحرف۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پہلی بات انھوں نے پوری دنیا بالخصوص ترقی یافتہ مغربی دنیا کے تناظر میں کی ہے اور دوسری بات خالص پاکستانی تناظر میں اور وہ بھی ایک خاص فکری سکول کے حوالے سے۔

برصغیر پر اسلامی حکومت کے دور کا ذکر کرتے ہوئے رضوی کہتے ہیں کہ جب مسلمان یہاں آئے تو پدری اصول یعنی مذہب اور مذہب سے متعلق مابعد الطبیعیات اور رسوم واقدار اپنے ساتھ لائے چاہے وہ دنیا کے کسی بھی خطے سے آئے تھے، یہ پدری اصول سب کے پاس تھا اور یہاں آکر انھوں نے یہاں کی مٹی سے تعامل کیا جس کے نتیجے میں وہ تہذیب پیدا ہوئی جسے ہند اسلامی تہذیب کہا جاتا ہے اور سجاد باقر رضوی ہند اسلامی تہذیب پر ہی ایک متحرک اور تخلیقی تہذیب کی بنیاد رکھنے میں دل چسپی رکھتے ہیں لیکن وہ دوسروں کی تہذیب وروایت کو اپنانا درست خیال نہیں کرتے اور اسے ان کی تہذیب میں اضافہ خیال کرتے ہیں۔ اس بات کو اگر پاک وہند کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ بات یوں ہوگی کہ مسلمانوں کی تہذیب میں پدری اصول غالب ہے اور ہندو تہذیب میں مادری اصول، اس لیے مسلمانوں اور ہندوؤں کی تہذیب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ البتہ اس خطے میں جو مماثلتیں نظر آتی ہیں وہ مادری اصول زندگی کے باعث ہیں اور اختلافات پدری اصول زندگی کے باعث ہیں۔

حوالہ جات

1۔ قدرت اللہ فاطمی، "ثقافت کے جغرافیائی عوامل" ، مشمولہ، *پاکستانی ثقافت*، مرتبہ رشید امجد، اسلام آباد، اکادمی ادبیات ۱۹۹۹، ص ۸۰

2۔ شہزاد احمد، *دوسرا رُخ*، لاہور، سنگِ میل، ۱۹۹۰، ص ۲۱۲

3۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، "کلچر اور پاکستانی کلچر" ، مشمولہ، *پاکستانی ثقافت*، مرتبہ، رشید امجد، ص ۲۰۸

4۔ محمد علی صدیقی، "قومی ثقافت کی تلاش میں"، مشمولہ، نیا دور کراچی، شمارہ ۵۳، ۵۴، ۱۹۷۰، ص ۲۶۷

5۔ قدرت اللہ فاطمی، "ثقافت کے جغرافیائی عوامل"، مشمولہ، *پاکستانی ثقافت*، مرتبہ، رشید امجد، ص ۸۱

6۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، *کلچر کے خدوخال*، لاہور، مجلس ترقیِ ادب، ۲۰۰۹، ص ۶۷

7۔ ایضاً، ص ۶۹

8۔ وحید قریشی۔ ڈاکٹر، "پاکستانی قومیت کی تشکیل نو"، مشمولہ، *پاکستانی ثقافت*، مرتبہ، رشید امجد، ص ۱۲۲

9۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر، "اسلامی ہندی کلچر"، مشمولہ *کلچر*، منتخب تنقیدی مضامین، اشتیاق احمد، لاہور، بیت الحکمت، 2007، ص ۲۵۴

10۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، "کلچر اور پاکستانی کلچر"، مشمولہ، *پاکستانی ثقافت*، مرتبہ، رشید امجد، ص ۲۰۹

11۔ انتظار حسین، بحوالہ، وزیر آغا، ڈاکٹر، *کلچر کے خدوخال*، ص ۱۰۰

12۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، بحوالہ، پیش لفظ، *کلچر*، منتخب تنقیدی مضامین، اشتیاق احمد، ص ۱۸

13۔ اعتزاز احسن، *سندھ ساگر اور قیام پاکستان*، مترجم، مستنصر جاوید، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، 2008، ص ۵۰۔۴۹

14۔ ایضاً، ص ۱۰۲

15۔ ایضاً، ص۳۸

16۔ ابنِ حنیف، دنیا کا قدیم ترین ادب (اول)، ملتان، بیکن بکس، 1998، ص۱۰۵

17۔ اعتزاز احسن، سندھ ساگر اور قیام پاکستان، مترجم، مستنصر جاوید، ص۱۶۲۔۱۶۱

18۔ ایضا، ص۱۶۲

19۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، کلچر اور پاکستانی کلچر، مشمولہ، پاکستانی ثقافت، مرتبہ، رشید امجد، ص۲۰۷

20۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، "کلچر کا مسئلہ"، مشمولہ، پاکستانی ثقافت، مرتبہ، رشید امجد، ص۹۹۔۹۸

21۔ احمد ندیم قاسمی، "پاکستانی تہذیب کی صورت پذیری"، مشمولہ، کلچر، منتخب تنقیدی مضامین، اشتیاق احمد، ص۱۱۱

22۔ ایضاً، ص۱۱۲۔۱۱۱

23۔ ایضاً، ص۱۱۲

24۔ فیض احمد فیض، پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش، لاہور، فیروز سنز۱۹۸۸، ص۳۰

25۔ ایضا، ص۳۴

26۔ عکسی مفتی، پاکستانی ثقافت، لاہور، الفیصل ناشران و تاجران کتب، جون ۲۰۱۴، ص۸۰

27۔ ایضاً، ص۸۰

28۔ محمد علی صدیقی، "قومی ثقافت کی تلاش میں"، مشمولہ، نیادور، کراچی، شمارہ ۵۴، ۵۳، ۱۹۷۰، ص۲۶۷

29۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، تہذیب و تخلیق، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷، ص۶۹۔۶۸

30۔ ایضاً، ص۷۰